مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

نیکی کی حقیقت

آیۃُ البِرّ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتابچہ ـــــــــــــــــــ نیکی کی حقیقت (درس نمبر 2)

طبع سوم (اگست 2004ء) ـــــــــــــــــــ 2200

ناشر ـــــــ ناظم نشر واشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ـــــــــــــــ 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ـــــــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ـــــــــــــــــــ 10 روپے

درس ۲

نیکی کی حقیقت اور تقویٰ کا قرآنی معیار

آیۃُ البِر (یعنی سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷) کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ ﴾

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب پر اس سلسلۂ مضامین میں گفتگو ہو رہی ہے اس کا پہلا سبق سورۃ العصر پر مشتمل تھا۔ اس کا دوسرا درس "آیۂ بِر" پر مشتمل ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ ہے اور مصحف میں دوسرے پارے کے چھٹے رکوع کے آغاز میں وارد ہوئی ہے۔ اس آیت کے بارے میں بعض ابتدائی اور تمہیدی باتوں پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا ایک رواں ترجمہ ہمارے سامنے آ جائے۔ اس آیۂ مبارکہ کا رواں اور سلیس ترجمہ یہ ہو گا :

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو' اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر' اور جنگ کے وقت.... یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔"

اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں اس ترجمے کو ذہن میں رکھ کر اب چند باتیں نوٹ کیجئے۔

۱)..... سب سے پہلی بات یہ کہ یہ ایک آیت ہے جبکہ اس منتخب نصاب میں پہلا سبق ایک سورۃ پر مشتمل تھا' لیکن یہ آیت اس کے مقابلے میں حجم کے اعتبار سے کئی گنا بڑی ہے۔ اس کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ قرآن حکیم میں آیات چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی۔ صرف ایک لفظ پر مشتمل بھی آیت ہے' جیسے "وَالْعَصْرِ ۝" آیت مکمل ہو گئی بلکہ صرف حروفِ مقطعات پر مشتمل بھی آیات ہیں' اور اتنی طویل آیات بھی ہیں کہ جن میں سے ایک کا اس وقت ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ سورۃ العصر بہت مختصر ہے جبکہ سورۃ البقرہ ۲۸۶ آیات پر مشتمل اور اڑھائی پاروں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تمام امور اصطلاحاً توقیفی کہلاتے ہیں۔ یعنی ان میں کسی گرامر کے اصول کو یا کسی منطق کے قاعدے کو دخل نہیں ہے۔ اسی طرح نہ یہ انسانی اجتہاد پر مبنی ہیں اور نہ ہی ان کا انسان کی سوچ یا قیاس پر مدار ہے' بلکہ یہ امور ہمیں نبی اکرم ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ گویا کہ یہ موقوف ہیں حضورؐ کے بتانے پر۔ ایسے تمام امور توقیفی کہلاتے ہیں۔

۲)..... دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک اس آیہ مبارکہ کے مضامین کا تعلق ہے اگر

غور کریں گے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور سورۃ العصر کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت اور مشابہت ہے۔ ذرا یاد کیجئے تو سورۃ العصر میں ہمارے سامنے انسان کی فوز و فلاح کے چار لوازم آئے تھے: (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔۔۔ اب ذرا اس آیت پر غور کیجئے۔ سورۃ العصر میں ایک جامع اصطلاح عنوان کے طور پر آئی تھی "ایمان" یہاں پانچ ایمانیات کا ذکر ہے: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ اس کی تشبیہ ایک کلی کی سی ہے جو ابھی کھلی نہ ہو۔ اس میں پتیاں تو ہوتی ہیں لیکن نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ کھلتی ہے اور پھول بنتا ہے تو پتیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح لفظ ایمان میں یہ تمام مضامین موجود ہیں، لیکن سورۃ العصر میں وہ ابھی ایک بند کلی کی مانند ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ میں ہم نے دیکھا کہ وہ کلی کھل گئی۔ پھول سامنے آگیا اور پانچ پتیاں نمودار ہو گئیں۔ گویا ایمان کسے کہتے ہیں؟ اللہ پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، یومِ آخر پر ایمان، کتابوں پر ایمان، انبیاء پر ایمان۔

سورۃ العصر کا دوسرا جامع عنوان تھا "عملِ صالح" اس کی کوئی تفصیل وہاں ممکن نہیں تھی۔ یہاں اگر غور کریں تو عمل صالح کے اس جامع عنوان کے تحت تین ذیلی عنوان قائم کئے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلا ہو گا "انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا عنوان" یعنی انسان اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی اپنی دولت جو اسے طبعاً مرغوب اور محبوب ہے اسے وہ اس طبعی محبت کے علی الرغم اپنے ابنائے نوع کی تکلیف کو دور کرنے میں صرف کر سکے۔ دوسرا ذیلی عنوان بن جائے گا "عبادات یا حقوق اللہ" کا، جن میں سے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر آگیا۔ تیسرا ذیلی عنوان ہو گا "معاملات" کا، اس لئے کہ ایفائے عہد کا بنیادی تعلق معاملاتِ انسانی سے ہے۔ ہمارے تمام معاملات خواہ لین دین اور کاروبار کے قبیل سے ہوں، خواہ آجر و مستأجر کے تعلق کے ذیل سے ان کی حیثیت معاہدوں کی سی ہوتی ہے۔ اسی طرح شادی بھی ایک سماجی معاہدہ ہے۔ گویا تمام انسانی معاملات کی اصل بنیاد عہد اور معاہدے پر قائم ہے۔ لہٰذا اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد پیدا ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ انسانی تعلقات کی stream lining ہو جائے گی اور جملہ انسانی تعلقات کا معاملہ درست ہو جائے گا۔

سورۃ العصر میں "عمل صالح" ایک جامع اصطلاح تھی۔ یہاں اس کے تین ذیلی عنوانات ہمارے سامنے آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ایک درخت کے تنے سے تین بڑی بڑی شاخیں نکلیں۔ گویا عمل صالح جو سورۃ العصر میں آیا وہ تنے کی مانند ہے اور اس سے جو تین بڑی بڑی شاخیں اس آیۂ مبارکہ میں نکلتی نظر آ رہی ہیں وہ ہیں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق، حقوق اللہ اور عبادات، اور معاملاتِ انسانی میں ایفائے عہد۔

سورۃ العصر کے آخر میں تواصی بالصبر کا ذکر ہے، اور یہ آیت بھی ختم ہو رہی ہے ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ کے الفاظِ مبارکہ پر۔ "اور بالخصوص صبر کرنے والے....." اور صبر کے مقامات یا مواقع میں سے بھی تین کا ذکر کر دیا گیا۔ جیسے عمل صالح کے تین ذیلی عنوانات آئے تھے۔ صبر کے تین مواقع میں سے پہلا "البأساء" ہے۔ "بأساء" کہتے ہیں فقر و فاقہ اور تنگی کو۔ دوسرا "الضراء" ہے۔ یہ ضرر سے بنا ہے۔ یعنی تکلیف، خواہ جسمانی اذیت ہو خواہ ذہنی کوفت۔ پھر ظاہر بات ہے کہ صبر و مصابرت اور ثبات و استقلال کے اصل امتحان کا آخری میدان، میدان جنگ ہے، جہاں انسان جان کی بازی کھیلتا ہے اور نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کو خطرے میں ڈالتے ہوئے میدان میں آتا ہے۔

گویا سورۃ العصر کے ساتھ اس آیت کے مضامین کا بڑا گہرا ربط ہے اور اسی مناسبت سے ہم نے اس منتخب نصاب میں اس کو سبق نمبر ۲ کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا اصل مضمون کیا ہے؟ اس کا آغاز ہوتا ہے: "﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ کے الفاظ سے۔ یعنی "نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو" گویا نیکی کے ایک محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی۔ آگے فرمایا: "﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ اور اس کے بعد نیکی کا ایک جامع اور مکمل تصور پیش کیا۔ لہٰذا یہی اس آیۂ مبارکہ کا اصل موضوع اور مضمون ہے۔

موضوع کی اہمیت

اب سب سے پہلے تو اس موضوع کی اہمیت پر غور کر لینا چاہیے! دیکھئے، جس طرح ہمارا مادی وجود ہے، اس کے لئے کچھ چیزیں بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے بغیر ہماری زندگی کا تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ہوا ہے، پانی ہے، غذا ہے۔ ان کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ بالکل اسی طرح انسان کی ایک معنوی زندگی ہے جس کے لئے اس کی انا یا خودی کا زندہ اور برقرار رہنا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے یہ چیز لازمی ہے کہ ہر انسان نیکی کے کسی نہ کسی تصور کو اختیار کرے اور اس کے ذریعے اپنے ضمیر کو مطمئن کرے، خواہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے کتنا ہی برا انسان ہو۔ گویا یہ انسان کی ناگزیر مجبوری ہے کہ وہ نیکی کا کوئی نہ کوئی کھاتہ اپنی زندگی میں کھولے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرے کہ اگرچہ میرے اندر یہ اور یہ برائی ہے تاہم میں فلاں اور فلاں نیکی کے کام بھی تو کرتا ہوں۔ مزید برآں وہ اپنی برائیوں کو JUSTIFY اور RATIONALIZE بھی کرتا ہے کہ میں جس برائی میں مبتلا ہوں اس کے لئے میری یہ مجبوری ہے، وہ مجبوری ہے اور اس طرح وہ اپنے ضمیر کی خلش کو مٹاتا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کے جو طبقات اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ گرے ہوئے شمار ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی کا کوئی نہ کوئی تصور ان کے ہاں بھی موجود ہے۔ چنانچہ ڈاکوؤں، رسہ گیروں، جیب کتروں، حتیٰ کہ جسم فروشی کرنے والی فاحشہ عورتوں کے یہاں بھی ثواب اور پُن کے باقاعدہ کھاتے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ تو میں نے اُن طبقات کی بات کی ہے جن کے بارے میں کسی کی رائے بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سے ذرا آگے آیئے! تین طبقات آپ کو شرفاء میں ملیں گے کہ جن کے نیکی کے تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ایک طبقہ کچھ کاروباری حضرات اور تاجر پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ دیندار ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، عمرہ، مدارسِ دینی کی خدمت، علماء کی خدمت، ان امور میں یہ لوگ پیش پیش ہیں۔ لیکن اِلّاماشاء اللہ اس طبقے کی ایسی باتیں بھی سامنے آئیں گی کہ ٹیکس بچانے کے لئے غلط حساب کتاب بھی ہو رہا ہے، بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ بھی ہو رہی ہے، ذخیرہ اندوزی بھی ہے اور ملاوٹ

بھی، سودی معاملات میں بھی ملوث ہیں۔ اسی طریقے سے کبھی محسوس ہوگا کہ اگرچہ ویسے تو نمازی ہیں، حاجی ہیں، نیک بھی ہیں، لیکن ساتھ ہی بڑے کٹھور دل بھی ہیں، دل میں نرمی والی کیفیت موجود نہیں۔ گویا ایک ملغوبہ ہے کہ ایک طرف بھلائی ہے، نیکی ہے، خیر ہے، اور اس کے ساتھ بعض چیزیں وہ ہیں جو اخلاقی اور دینی اعتبار سے حددرجہ نامناسب ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ملے گا۔ وہاں یہ بات آپ کے سننے میں آئے گی کہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ انسان اپنے فرائضِ منصبی صحیح طور پر ادا کرے۔ باقی رہا نماز، روزہ کا معاملہ تو یہ اس کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو اپنے لئے کرتا ہے، اگر نہیں کرتا تو بہرحال یہ بھی اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تصوّرِ نیکی بالکل برعکس ہے اس تصوّرِ نیکی سے جس کا پہلے بیان ہوا۔

ایک اور عدم توازن اس صورت میں نظر آجائے گا کہ اکثر لوگوں کی دین کے ظاہری اور رسمی پہلوؤں پر تو بڑی کڑی نگاہ ہے، اس کے بارے میں حساس بھی بہت ہیں۔ ذرا سی کمی بیشی کو بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں، لیکن جو روحِ دین ہے، اصل تقویٰ ہے، اصل خدا ترسی ہے، اس پر بالکل کوئی توجہ نہیں۔ نیکی کے یہ مختلف تصورات آپ کو خود اپنے معاشرے میں ملیں گے۔

میں نے جس آخری بات کا ذکر کیا ہے اسی کے حوالہ سے یہ آیۂ مبارکہ شروع ہوتی ہے۔ نماز کا ایک ظاہر ہے، اس میں آپ قبلہ رُو کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے ظاہر کا ایک جزو ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن جب کچھ لوگوں میں ظواہر ہی کی اہمیت رہ جاتی ہے اور جو اصل روحِ نماز ہے اس پر سے توجہ کم ہو جاتی ہے تو پھر وہ غیر متوازن کیفیت ظہور میں آتی ہے جو اصلاً مطلوب نہیں۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا کہ۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اس تصورِ نیکی کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اس نفی کے بعد اثبات آیا ہے کہ اصل نیکی کیا

ہے اور نیکی حقیقتاً کسے کہتے ہیں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس آیۂ مبارکہ میں نیکی کے ایک سطحی اور محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی اور پھر نیکی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بیان فرمایا گیا۔ گویا اس آیت کا اسلوب وہی ہے جو ہمارے کلمۂ طیبہ کے پہلے جزو کا ہے۔ یعنی کلام کا آغاز نفی سے ہوتا ہے جو اثبات کی طرف رہنمائی کرتی ہے' جیسے لاالٰہ کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اِلاَّ اللہ کے اثبات پر ختم ہوئی۔ بعینہٖ یہی معاملہ اس آیۂ مبارکہ کا ہے کہ "لَيْسَ الْبِرَّ" سے نفی کا آغاز ہوا اور پھر "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ" سے "هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" تک مثبت انداز میں نیکی اور تقویٰ کا معیار بیان فرمادیا گیا۔

"بِر" کے لفظی معنی

اب لفظ "بِر" پر غور کیجئے جس کے معنی کو ہم نے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' لیکن اس لفظ کی اصل روح کیا ہے؟ اور نیکی سے اس کی مناسبت کیا ہے؟ ان امور پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے حروفِ اصلیہ ہیں "ب ۔ ر ۔ ر ۔" اسی مادے سے لفظ "بِر" بنا ہے اور اس سے ایک دوسرا لفظ بَر بنا ہے۔ چنانچہ "بحروبر" اردو میں عام طور پر مستعمل ہے اور تمام اردو دان جانتے ہیں کہ بَر کے معنی خشکی کے ہیں۔ بِر اور بَر میں جو قدرِ مشترک ہے پہلے اس کو سمجھ لیجئے۔ انسان جب سمندر میں ہوتا ہے تو ہچکولے لگتے ہیں' سمندری طوفان کا اندیشہ رہتا ہے اور انسان کو ایک تشویش لاحق رہتی ہے۔ اسے وہ اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوتا جو خشکی پر ہوتا ہے' لیکن انسان جب ساحل پر اترتا ہے اور جیسے ہی اس کے پاؤں بَر (خشکی) پر لگتے ہیں اطمینان و سکون کی ایک کیفیت اسے فی الفور حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی اطمینان و سکون اس لفظ کی اصل روح اور جان ہے۔ پچھلی قسط میں عرض کیا گیا تھا کہ انسان کے وہ اعمال جو اسے قلبی سکون عطا کرتے ہیں' جو ضمیر کی خلش کو مٹاتے ہیں' جو تسکینِ باطنی کا موجب ہوتے ہیں' انہی کو ہم نیکی کے عنوان سے منسوب کرتے ہیں۔ انگریزی کی ایک نظم میں جس کا عنوان "Charity" ہے' یہ تصور اور تخیل بڑی عمدگی سے آیا ہے۔ نظم ہے :

Charities that soothe and heal and bless.
Are scattered over the feet of men like flowers.
No mystery is here no special boon.
For the high and not for the low.
The smoke ascends as high from the hearth of a humble cottage.
As from that of a haughty palace.

"وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جو سکون بخشتی ہیں اور زخموں کو مندمل کرتی ہیں اور رحمت کا باعث بنتی ہیں' انسان کے قدموں پر پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اس معاملے میں نہ کوئی راز کی بات ہے اور نہ ہی کسی پر خصوصی نوازش و کرم۔ بلکہ ان کا معاملہ بالکل اس دھوئیں کی مانند ہے جو کسی غریب کی کٹیا کے چولہے سے بھی اسی طرح بلند ہوتا ہے جیسے کسی مغرور انسان کے محل کے آتشدان سے!"

گویا نیکی میں' خیر میں' بھلائی میں' خدمتِ خلق میں ایک عجیب تسکین بخش کیفیت ہوتی ہے' بالکل ایسی جیسے کہ کسی زخم پر مرہم کا پھایا رکھ دیا جائے۔ چنانچہ یہی قدر مشترک ہے "بِر" اور "بَر" کے مابین!

نیکی اور ایمان کا باہم تعلق

اس آیۂ مبارکہ پر تدبّر کے ضمن میں جو پہلی بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کی بحث میں سب سے پہلے ایمان کا ذکر کیوں ہو رہا ہے۔ بظاہر یہ بات ہمارے عام تصورات کے اعتبار سے کچھ انمل اور بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہم تو نیکی کا تعلق عمل سے سمجھتے چلے آ رہے ہیں' یہ ایمان کی بحث یہاں کیسے آ گئی! پھر یہ کہ یہاں صرف ایمان باللہ ہی نہیں' چند اور ایمانیات کا ذکر بھی شدّومد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان ایمانیات کا نیکی کی بحث کے ساتھ کیا معنوی تعلق ہے!

سب جانتے ہیں کہ فلسفہ اخلاق عمرانیات کا ایک مستقل اور نہایت اہم شعبہ ہے۔ مزید برآں اس فلسفہ اخلاق میں دو سوالات بنیادی ہیں۔ پہلا یہ کہ اخلاقی اقدار کیا ہیں؟ اور آیا وہ مستقل اور دائم ہیں یا ان میں حالات کے بدلنے اور زمانہ کے گزر جانے سے کوئی تغیّر و تبدّل ہوتا ہے یا نہیں؟ دوسرا بنیادی سوال اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ وہ قوتِ متحرکہ کون سی ہے جو انسان کو نیکی پر کاربند رکھے' خواہ اس میں فوری طور پر نقصان یا

تکالیف کا سامنا ہو؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ حساس اور طبّاع شاعر انسانی احساسات کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس جذبۂ محرکہ کے ضمن میں مرزا غالب نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اور حالی نے مجبوری اور لاچاری کی نیکی اور پارسائی پر نہایت خوبصورت پھبتی چست کی ہے کہ۔

رکا ہاتھ جب' پارسا ہو گئے ہم
نہیں پارسائی' یہ ہے نارسائی!

گویا سوال یہ ہے کہ شر اور شرارت پر قادر ہونے کے باوجود' جب کہ اس میں فوری لذت یا نفع بھی ہو' انسان کی طبیعت کو خیر اور زہد کی طرف لانے والی شے کون سی ہے! ایک شخص کو معلوم ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے لیکن وہ دیکھ رہا ہے کہ جھوٹ بولنے پر مجھے کچھ نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ اب وہ کون سی چیز ہے جو اسے جھوٹ بولنے سے باز رکھے اور سچ بولنے پر آمادہ کرے' خواہ سچ بولنے میں نقصان نظر آ رہا ہو؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اس ضمن میں قرآن حکیم کا فلسفہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کا بنیادی شعور فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو ظاہری استعدادات دی ہیں جیسے سماعت ہے' بصارت ہے' قوتِ گویائی ہے' تعقّل ہے اور اسی نوع کی دوسری استعدادات ہیں' ویسے ہی فطرتِ انسانی میں کچھ باطنی استعدادات بھی مضمر ہیں جن کو دے کر انسان دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فطری طور پر جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے! آخری پارے کی سورۃ الشمس میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾
"اور شاہد ہے نفس انسانی اور جو اس کو سنوارا اور بنایا اور جو اس کی نوک پلک درست کی اور اس میں الہامی طور پر فجور و تقویٰ اور خیر و شر کا علم ودیعت کر دیا۔" اسی لئے نیکی کے لئے قرآن مجید کی ایک کثیر الاستعمال اصطلاح "معروف" ہے' یعنی جانی پہچانی چیز---اور

بدی کے لئے "منکر" ہے یعنی اجنبی سی بات جسے فطرتِ انسانی قبول نہیں کرتی اور اس سے اِباء کرتی ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک یہ دائمی اقدار ہیں۔ چنانچہ سچ بولنا ہمیشہ سے نیکی تصور کیا گیا ہے اور آج بھی اسے نیکی سمجھا جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کا ضمیر یہ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک برا کام کر رہا ہے خواہ وہ اپنے آپ کو کسی مجبوری کے حوالے سے قائل کر لے' لیکن دل کی گہرائی میں جانتا ہے کہ میں ایک برا کام کر رہا ہوں۔ الغرض یہ دائمی اور بدیہی اقدار ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر نیکی اور بدی کے ان بنیادی تصورات کے ضمن میں صدفی صد راست آتا ہے کہ ۔

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید!

مادی احوال بدلتے رہتے ہیں۔ سطحی سے تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب و تمدن میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ لیکن فطرت انسانی کے محکمات اور بدیہیات غیر متبدل اور دائم و قائم ہیں۔

دوسری بات کے لئے میں مغربی فلاسفروں میں سے کانٹ کا حوالہ دوں گا کہ اس نے پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا "Critique of Pure Reason"۔ اس میں اس نے ثابت کیا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے اہل منطق نے جتنے دلائل فراہم کئے ہیں' ان کو خود منطق کاٹ دیتی ہے۔ ان میں سے کوئی دلیل تنقید اور محاکمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی' اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے بعد اس نے دوسری کتاب "Critique of Practical Reason" لکھی۔ اس میں اس نے یہ بات پورے شدّومد کے ساتھ پیش کی ہے کہ انسانی اخلاق کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک کہ وہ خدا کو نہ مانے۔ اس کے بغیر اخلاقیات کے لئے کوئی اساس ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر انسان کو اخلاقی رویّہ اختیار کرنا ہے تو اسے خدا کو ماننا ہو گا۔ اس کے بغیر انسان کو کوئی اخلاقی تشخص اور تمکن حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ یہی ہے وہ حقیقتِ نفس الامری جو اس آیت میں بیان فرمائی گئی کہ ایمان بالآخرۃ نیکی اور بھلائی کے لئے قوتِ محرکہ فراہم کرتے ہیں۔ قرآن انسان سے کہتا ہے نیک بنو'

اچھے اور بھلے کام کرو کیونکہ اللہ کو نیک لوگ پسند اور محبوب ہیں۔ حدیث کہتی ہے جملہ مخلوقات اللہ کے کنبے کے مانند ہیں' لہٰذا جو لوگ اللہ کی رضا کے جویا ہیں ان کو خدمتِ خلق کے لئے ہر دم کمربستہ رہنا چاہئے! الغرض نیکی کے لئے قوتِ محرکہ کا منبع اور سرچشمہ ہے ایمان باللہ۔ واضح رہے کہ یہ مثبت قوتِ محرکہ ہے' اس لئے کہ محبت ایک مثبت جذبہ ہے اور ایمان باللہ کا حاصل محبتِ الٰہی ہے۔

لیکن سب جانتے ہیں کہ تمام انسان عقل و شعور کی سطح کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ضرورت ہے کسی اور قوتِ محرکہ کی جو ع

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی!

کے مصداق ایک تازیانے کا کام دے اور وہ قوتِ محرکہ ہے ایمان بالآخرۃ' یعنی accountablity کا احساس کہ ایک دن آنے والا ہے جب محاسبہ ہوگا' ہمیں ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس ایمان بالآخرۃ کو آپ چاہیں تو ایمان باللہ کے مقابلے میں منفی قوتِ محرکہ کہہ سکتے ہیں' کیونکہ اس کی بنیاد محاسبۂ اخروی کے خوف پر ہے۔

اِنّما الاعمالُ بالنِّیّات

ہماری اب تک کی بحث کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا جو عمل ان دو محرکات پر مبنی نہ ہو وہ چاہے کتنا ہی بڑے سے بڑا نیکی کا کام نظر آئے' از روئے قرآن و حدیث وہ نیکی کا کام نہیں ہے' بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی دنیوی غرض پوشیدہ ہوتی ہے' جب کہ تاکیدی ہدایت یہ ہے کہ ع "سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے!" کے مصداق نیکی کو کاروبار نہ بنالینا۔ نیکی سے دنیوی منفعت کو مدِ نظر مت رکھنا' نیکی کا فائدہ اس دنیا میں حاصل کرنے کی نیت نہ رکھنا۔ ایسا کریں گے تو اس نیت و ارادہ کے تحت نیکی کے جتنے کام کئے جائیں گے از روئے قرآن سب باطل ہو جائیں گے۔ اسی کو ہم اصطلاحِ دینی میں کہتے ہیں کہ کوئی نیکی خلوص و اخلاص کے بغیر اللہ تعالیٰ کی جناب میں قبول نہیں۔ اس پر اسلام نے اتنا زور دیا ہے کہ بعض احادیثِ شریفہ تو ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان واقعتاً لرز اٹھتا ہے۔ البتہ سب سے جامع

حدیث وہ ہے جس کے راوی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں اور اکثر محدثین نے جو احادیثِ نبویؐ کے مجموعے مرتب کئے ہیں ان کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اِنَّمَا الاعمالُ بِالنِّیَّات وانّما لکلّ امرئٍ ما نویٰ" (متفق علیہ) "اعمال کا دارومدار، نیکیوں کا انحصار نیتوں پر ہے اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو"۔ یعنی اگر ایک شخص نے ایک اچھا عمل کیا لیکن اس کے پیچھے کوئی بری نیت تھی تو اس کا عمل بھی برا شمار ہو گا اور اس کا نتیجہ بھی برا نکلے گا (اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ اگر انسان ایک برا عمل کرے جس میں اس کی نیت اچھی ہو تو اس کو اس کا اجر ملنا چاہئے۔ اس لئے کہ حدیثِ مبارک میں "اعمال" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اعمال سے مراد نیکی کے اعمال ہیں۔ "افعال" کا لفظ آتا تو وہ دونوں کا احاطہ کرلیتا۔ مزید برآں نیت کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہم اس پر اس کے ظاہر کے اعتبار سے برائی ہی کا حکم لگائیں گے۔ اس لئے کہ ہم دنیا میں صرف ظاہر پر ہی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی مخمصے میں ہو یا کسی ایسی مجبوری میں گرفتار ہو جس سے نکلنا اس کے لئے قطعاً ناممکن ہو تو اس کے لئے رعایت ہو سکتی ہے)۔ تو یہ ہے دونوں اعتبارات سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا تعلق نیکی کی بحث سے۔

ایمان بالرسالت اور اسوۂ حسنہ

بقیہ جو تین ایمانیات اس آیت میں مذکور ہیں یعنی ملائکہ پر ایمان، کتابوں پر ایمان، اور نبیوں پر، ایمان تو اگر ان تینوں کو بریکٹ کرلیا جائے تو ان کا حاصل ہو گا "ایمان بالرسالت" ---- ملائکہ ذریعہ بنتے ہیں وحی لانے کا نبیوں اور رسولوں تک ---- اس وحی کا ریکارڈ ہے کتابوں کی شکل میں اور جن پر وحی نازل ہوئی وہ انبیاء و رُسل ہیں۔ للذا تینوں کو جمع کیجئے تو یہ ایمان بالرّسالت ہے۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کی اس بحث کے ساتھ کیا ہے! اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ انسان کے اندر جس طرح دوسرے جذبات و داعیات ہوتے ہیں اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے اور جذبات و داعیات کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ اندھے ہوتے ہیں اور ان میں حدود سے تجاوز کا رجحان و میلان بالطبع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ

نیکی کے جذبہ کے ضمن میں بھی اس کا خطرہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کر حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نتیجتاً نیکی سے بدی ظہور میں آجائے۔ مثلاً ایک شخص پر نیکی کا اتنا غلبہ ہوا کہ اس نے دنیا کو چھوڑ دیا اور پہاڑوں کی کھوؤں اور غاروں مین جا کر دھونی رمائی کہ بس رب سے لو لگانی ہے۔ رہبانیت کا نظام اسی نیکی کے جذبہ کے حدِ اعتدال سے تجاوز کی وجہ سے وجود میں آیا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ رویّہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ فطرت انسانی میں جو داعیات ہیں یہ ان سے دھینگا مشتی ہے۔ چنانچہ طبعِ بشری اور فطرتِ انسانی بسا اوقات انسان کو پچھاڑ دیتی ہے۔ نتیجتاً اس کا ایک ردِّ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائی راہب خانوں میں ردِّ عمل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، حالانکہ رہبانیت دراصل نیکی کے جذبہ کے حدِ اعتدال سے تجاوز کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔

رہبانیت کی نفی ایک حدیث میں بڑی وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبّہ ہی کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین اشخاص ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نفلی عبادات کے بارے میں معلوم کیا کہ رات کو آپؐ کتنی نفلی نماز پڑھتے ہیں، مہینہ میں کتنے نفلی روزے رکھتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مطہرہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھی، اس میں تصنّع کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے کسی بات میں مبالغہ نہیں کیا، جو صحیح صحیح بات تھی وہ بتادی۔ ان صحابہؓ نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں، آپؐ سے تو کسی خطا کا صدور ممکن ہی نہیں، آپؐ کو تو اتنی نفلی عبادات کی بھی ضرورت نہیں جتنی آپ کر رہے ہیں، یہ بھی آپؐ کے لئے بہت ہے، لیکن ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ مین تو پوری رات نفلی نمازوں میں گزارا کروں گا، اپنی کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی اور گھر گرہستی کا کھکھیڑ مول نہیں لوں گا، اس سے تو اللہ سے لو لگانے اور تعلق استوار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، میں تو ساری عمر تجرد کی زندگی بسر کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی

خبر پہنچی تو آپ ؑ اپنی عادتِ شریفہ اور خُلقِ کریم کے خلاف ناراض ہوئے۔ آپ ؑ نے ان تینوں کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ "میں تم میں سے ہر ایک سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں، لیکن میں رات کو سوتا بھی ہوں اور نفلی نماز بھی ادا کرتا ہوں۔ میں نفلی روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے شادیاں بھی کی ہیں اور میرے حبالۂ عقد میں متعدد ازواج ہیں"۔ پھر آپ ؑ نے فرمایا: "مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي" (کان کھول کر سن لو چاہے کتنے ہی نیکی کے جذبے کے تحت ہو، لیکن) "جس کسی نے میری سنت اور میرے طریقے کو چھوڑ دیا (اور اس کے برعکس روش اختیار کی تو جان رکھو) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"..... پس اس طرح ہمارے لئے نیکی کے معیارِ کامل ہیں جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ نیکی کی بحث میں ایک اسوۂ حسنہ، ایک کامل نمونہ، ایک آئیڈیل اور ایک frame of reference ہمارے سامنے رہے جس میں نیکی کے تمام اعمال ایک توازن اور اعتدال میں سموئے ہوئے مل جائیں۔ اسی کو ہم کسوٹی سمجھیں، ہر عمل کے بارے میں اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ عمل اس معیارِ کامل میں کتنا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ اس کا تناسب کیا ہے..... یہ ہے وہ ضرورت جو "ایمان بالرسالت" سے پوری ہوتی ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ و کاملہ وہ ہے جو ہمیں انبیاء و رُسل کی زندگیوں میں ملتا ہے اور اس مقدس جماعت میں کامل ترین اور افضل ترین ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک اسوۂ حسنہ و کاملہ یعنی تمام نیکیاں، تمام بھلائیاں، تمام خیرات و حسنات اگر ایک شخصِ واحد میں معتدل، متوازن اور جامعیت کے ساتھ دیکھنی ہوں تو نمونہ اور کسوٹی ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الغرض فلسفہ اخلاق کے ساتھ ایمان کے ان تینوں اجزاء کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ نیکی کی جڑ اور بنیاد کے ساتھ ایمان کا جو لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے ناگزیر بیان کے لئے یہاں ایمان کا ذکر آیا ہے۔ اسے یہاں محدود مذہبی معنی اور تصور کے ساتھ محض بر سبیل تذکرہ یا بطورِ تبرک نہ سمجھ لیجئے گا۔

آیۂ بِر کے پہلے حصے کے حوالے سے حقیقتِ بِر کے متعلق بعض فلسفیانہ مسائل پر اجمالاً

گفتگو کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نیکی کی روحِ باطنی یعنی ایمان کا ظہور انسان کے عملی رویئے اور اس کی سیرت و کردار میں جس صورت میں ہوتا ہے اس کو قرآن حکیم کس پیرائے میں اور کس ترتیب سے بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لئے مناسب ہو گا کہ ہم پھر اس آیۂ مبارکہ کے رواں ترجمہ پر نظر ڈال لیں۔ آیۂ مبارکہ کا سلیس ترجمہ یہ ہے :

"نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یومِ آخر پر، اور فرشتوں پر، اور کتابوں پر، اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال، اس کی محبت کے باوجود، رشتے داروں کو، یتیموں کو، محتاجوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور گلو خلاصی میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور عہد کے پورا کرنے والے جب باہم کوئی معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ پر، اور تکالیف و مصائب میں، اور جنگ کے میدان میں۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً سچے اور راست باز ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعتاً متقی ہیں۔"

اس آیۂ مبارکہ میں ایمان یا جن ایمانیاتِ خمسہ کا بیان ہوا ہے، ان کا نیکی کی بحث کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر کسی قدر غور و فکر ہم مکمل کر چکے ہیں۔ اب آیئے ہم دیکھیں کہ نیکی کی یہ روحِ باطنی جب کسی انسان میں سرایت کر جائے یا جب ایمانِ حقیقی انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو اس آیۂ مبارکہ کی رُو سے اس کے نتیجے میں اس انسان کی شخصیت، اس کی سیرت و کردار، اس کے معاملات، اس کے اعمال اور اس کے رویئے میں کن کیفیات کا ظہور ہوتا ہے جن کو از روئے قرآن حکیم نیکی کے عملی مظاہر قرار دیا جا سکتا ہے!

انسانی ہمدردی

یہاں نوٹ کیجئے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ایمانیات کے ذکر کے بعد نیکی کا جو مظہرِ اول بیان ہو رہا ہے وہ "خدمتِ خلق" اور "انسانی ہمدردی" ہے۔ اگرچہ آپ نے سن رکھا ہو گا اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ارکانِ دین میں کلمۂ شہادت کے بعد رکنِ اول اور رکنِ رکین، جس کو عماد الدین (دین کا ستون) قرار دیا گیا ہے وہ اقامتِ صلوٰۃ ہے، لیکن اس آیۂ مبارکہ

میں نماز کا ذکر مؤخر ہو گیا ہے اور اس سے بھی پہلے اپنے مال کو ابنائے نوع کی تکلیفوں کو رفع کرنے ' ان کی احتیاجات کو دور کرنے اور ان کی مصیبتوں سے انہیں نجات دلانے میں صرف کرنے کا ذکر نہایت اہتمام اور شدّومد کے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ معاملہ بہت اہم ہے اور واقعہ یہی ہے کہ جہاں کہیں نیکی کی حقیقت کی بحث ہو گی وہاں ترتیب وہ ہو گی جو اس آیۂ مبارکہ میں ہے ' لیکن جہاں ارکانِ اسلام کی گفتگو ہو گی وہاں ترتیب وہ رہے گی جو مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے ' جس کا مفہوم یہ ہے :

"اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر تعمیر کی گئی ہے : کلمۂ شہادت ' نماز ' زکوٰۃ ' صومِ رمضان ' اور حج" (بخاریؒ و مسلمؒ ' عن عبداللہ بن عمرؓ)

یہاں چونکہ بحث نیکی کی حقیقت سے ہے لہٰذا یہاں اس کی مناسبت سے ترتیب قائم کی گئی کہ انسان کے عملی رویئے میں نیکی کا ظہورِ اول "انسانی ہمدردی" کو قرار دیا گیا۔ قرآن مجید اس بات پر جس قدر زور دیتا ہے اس کا اندازہ آپ چوتھے پارے کی پہلی آیت سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس میں یہ معاملہ بہت نمایاں ہو کر آتا ہے ' فرمایا :

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾

"تم نیکی کے مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو (اللہ کی راہ میں) وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے۔"

یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اتر گئی ہو ' نہ وہ چیز جو ازکاررفتہ ہو گئی ہو ' بلکہ وہ چیز جو محبوب ہو۔ اگر تم محبوب چیز یعنی مال اللہ کی راہ میں اپنے ابنائے نوع کی تکالیف رفع کرنے میں خرچ نہیں کر سکتے تو یہ بات جان لو کہ نیکی میں سے تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور تمہارا شمار اتقیاء و ابرار میں نہیں ہو سکے گا!

یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا ایک مفہوم ہوتا ہے اور اس کے کچھ مضمرات و مقتضیات ہوتے ہیں جو اس سے جدا نہیں کئے جا سکتے ' خاص طور پر جو الفاظ اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لیں تو ان کا ایک خاص مفہوم (CONNOTATION) معیّن ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص عالم ہے تو لفظ عالم کا اپنا ایک مفہوم ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ کوئی شخص زاہد ہے یا عابد ہے تو زاہد اور عابد کا اپنا اپنا

جداگانہ مفہوم ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص عالم ہو' عابد ہو' زاہد ہو' لیکن از روئے قرآن وہ شخص نیک شمار نہیں ہو گا' نہ ہی اس کا شمار ابرار میں ہو گا جب تک اس کے اندر انسانی ہمدردی کا وصف اور بنی نوع انسان کی تکالیف کو دُور کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظِ مبارکہ سے تو یہ بات نیکی کی بحث میں واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آتی ہی ہے لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ مضمون قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات پر بھی مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا معاملہ تو یہ ہے ہی کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"۔ چنانچہ سورۃ اللیل میں فرمایا کہ ﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ۝﴾ "لوگو! تمہاری سعی و جہد' تگ و دو' اور بھاگ دوڑ کے نتائج بڑے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں"۔ پھر دو مختلف نتیجوں کا ذکر فرمایا : ﴿فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۝ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ۝﴾ "سو جس نے سخاوت اختیار کی' اور برائی سے بچا اور بھلی بات کی تصدیق کی' اسے ہم رفتہ رفتہ بڑی آسانی کا اہل بنا دیں گے"۔ گویا ایک راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم ہے "اعطاء" یعنی جُود و سخا۔ یہ راستہ آسانی کی طرف لے جانے والا ہے' اس کے برعکس راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم بخل ہے : ﴿وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ۝ وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ۝﴾ "اور جس نے بخل سے کام لیا اور لاپروائی اختیار کی اور بھلی بات کی تکذیب کی' اسے ہم رفتہ رفتہ کڑی سزا کا مستوجب بنا دیں گے"۔ گویا یہ راستہ تنگی اور سختی کا راستہ ہے۔ اسی طرح سورۃ البلد میں فرمایا کہ ہم نے انسان پر کیا کیا اور کیسے کیسے احسانات کیے ﴿اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۝ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۝ وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۝﴾ "کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں! اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے! اور اس کو دونوں راہیں (بِرّ و تقویٰ اور فسق و فجور کی راہیں) سُجھا نہیں دیں!" لیکن یہ انسان بڑا تھڑدلا ثابت ہوا اور کم ہمت اور ناشکرا نکلا : ﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ۝ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ ۝ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۝ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ۝ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ۝ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ۝﴾ "وہ گھاٹی عبور نہ کر سکا اور کیا سمجھے تم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟" اب آگے اس گھاٹی کا ذکر ہے جس کا تعلق

انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق میں اپنے مال کو خرچ کرنے سے ہے۔ فرمایا : "کسی گردن کو چھڑا دینا' کسی کی گلو خلاصی کرا دینا۔ کسی یتیم کو قحط کے ایام میں جب کہ اپنے لالے پڑے ہوئے ہوں کھانا کھلا دینا جبکہ وہ قرابت دار بھی ہو' اور کسی مسکین کو کھانا کھلا دینا جب کہ وہ خاک میں رل رہا ہو" ۔ یہ ہے مشکل وادی۔ اگر انسان اس کو عبور کر لے اور پھر شعوری طور پر ایمان لائے تو وہ نورٌ علٰی نور والا ایمان ہو گا۔ چنانچہ اسی سورۃ البلد میں اس آیت سے آگے فرمایا : ﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ ﴾ "پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے' اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی ہمدردی کی پر زور تاکید کی!"..... واضح رہے کہ تقریباً سورۃ العصر کا مضمون سورۃ البلد کی اس آیت میں بھی آ گیا ہے۔ یہ گویا وہی بات ہے کہ ؎ "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"۔

اس موقع پر چند احادیثِ نبویہ' بھی پیش نظر رہیں جو علم و حکمت کے بڑے بڑے خزانے ہیں' جن میں اسی مفہوم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کوزہ میں دریا بند کرنے" کے سے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : ((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ حُرِمَ الْخَيْرُ كُلَّه)) "جو شخص دل کی نرمی سے محروم رہا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا"۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں : ((مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ)) "اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا"۔ ایک اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰه)) "کل کی کل مخلوق اللہ کے کنبے کی مانند ہے"۔ لہٰذا اگر اللہ سے محبت ہے تو کیا اس کے کنبے یعنی مخلوق سے محبت نہیں ہو گی! ایک حدیثِ قدسی میں الفاظ آتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شکوہ فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! میں بھوکا تھا' میں نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو نے مجھے کھلایا نہیں۔ اے میرے بندے! میں ننگا تھا' میں نے تجھ سے چاہا کہ مجھے کپڑا پہنا دے' تو نے نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار! تو پاک ہے اس سے کہ تجھے بھوک لگے یا عریانی لاحق ہو۔ اللہ فرمائے گا کہ میرا وہ فلاں بندہ جو تیرے پاس اس وقت حاضر ہوا تھا وہ بھوکا تھا اور فلاں بندہ جو تیرے پاس اس وقت آیا تھا کہ اس کے پاس ستر پوشی

کے لئے مناسب لباس نہیں تھا' ان کا جو ہاتھ تیرے سامنے دست سوال بن کر آیا تھا' وہ میرا ہی ہاتھ ہے۔ اندازہ لگایئے کہ یہ اہمیت ہے ہمارے دین میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی۔

خیرات و صدقات میں ترتیب

اب دیکھئے کہ ان الفاظ مبارکہ ﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ﴾ میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ آپ کے قرابت دار یعنی آپ کے قریبی عزیزوں میں سے جو مشکل اور تکلیف میں ہوں سب سے پہلے آپ کے حسن سلوک کے مستحق وہ ہیں' پھر وہ یتیم جو آپ کے قریب کے معاشرے میں بے سہارا ہیں' پھر مسکین۔ مسکنت کہتے ہیں کم ہمتی کو۔ جن کی ہمت جواب دے گئی ہو' جو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پا رہے ہوں' خود کفیل نہ ہوں۔ پھر وہ شخص جو حالتِ سفر میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے سفر میں محتاج ہو جائے' پھر وہ شخص جو دستِ سوال دراز کر رہا ہے۔ آپ کو کیا پتہ کہ کونسی احتیاج اسے لاحق ہوئی ہے جس کے باعث وہ اپنی خودی اور عزتِ نفس کو ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے' پھر وہ جس کی گردن کہیں کسی مخمصے میں پھنس گئی ہو۔ پچھلے زمانے میں یہ غلامی کا معاملہ تھا اور آج اس کے مصداق ہوں گے وہ لوگ جو قرض کے پھندے میں اس طرح پھنس جائیں کہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں لیکن اس سے نکل نہ پا رہے ہوں۔ تو یہ ترتیب بھی بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہاں صدقاتِ نافلہ کا ذکر ہے۔ صدقہ واجبہ زکوٰۃ ہے جس کا حکم آگے آ رہا ہے' اس کی مدات سورۂ توبہ میں بیان ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)) کہ لوگو! یہ مغالطہ نہ ہو کہ مال میں صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ یہ تو فرض ہے' اس کے علاوہ بھی تمہارے مال میں (حاجت مندوں کا) حق ہے۔ پھر آپ نے اس کی توثیق کے لئے یہی آیۂ مبارکہ پڑھی۔

ایک مزید بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ انفاقِ مال کی جن مدات کا آیۂ مبارکہ کے

اس حصے میں ذکر ہوا ہے' اس سے اصل مقصود انسانی ہمدردی اور ابنائے نوع کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اب سوال ہے مقدار اور مواقع کا' پھران میں اولیت اور ثانویت کا۔ ظاہر ہے کہ جس کی جتنی مقدرت ہے وہ اتنا ہی خرچ کر سکتا ہے' اس میں اولیت رشتہ داروں کو دی جائے گی' اقرباء کی ضرورت پوری کرنے کے بعد اگر کوئی مزید خرچ کرنے کی مقدرت رکھتا ہے تو وہ جتنا بھی اس دائرے میں آگے بڑھے گا اتنا ہی وہ اپنے لئے نیکی کا مزید ذخیرہ جمع کرتا چلا جائے گا۔

عبادات یا حقوق اللہ

اب آگے چلئے' فرمایا : ﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾ "اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے"---- صلوٰۃ کیا ہے؟' زکوٰۃ کیا ہے' ان کے لغوی معنی کیا ہیں! ہمارے دین میں ان کا مقام کیا ہے! اس پر اس وقت گفتگو نہیں ہو گی۔ یہ موضوعات اس سلسلۂ مضامین میں موزوں وقت پر زیر گفتگو آئیں گے' البتہ یہاں اس بات کو نوٹ کیجئے کہ درحقیقت ان دونوں کا نیکی کی اس بحث سے گہرا ربط و تعلق ہے۔ اب تک دو باتیں سامنے آئی ہیں' ایک نیکی کی روحِ باطنی اور وہ ہے ایمان۔ ایک اسی روح باطنی کا مظہرِ اول اور وہ ہے خدمتِ خلق' ابنائے نوع کی تکالیف کو دور کرنے میں اپنا مال صرف کرنا۔ اب دیکھیں کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر لازم و ملزوم کے تعلق کے طور پر آیا ہے۔ نیکی کی روح باطنی یعنی ایمان کی آبیاری اور اسے تر و تازہ رکھنے والی چیز نماز ہے۔ اللہ سے تعلق قائم و دائم رہے' اس کی یاد مستحضر رہے۔ آخرت کی فکر دل میں موجود رہے۔ ان امور کی تذکیر کے لئے' یاد دہانی کے لئے اولین' اہم ترین اور مقدم ترین شے نماز ہے۔ گویا ایک ستون ہے جو ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لئے گاڑ دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انفاقِ مال کے لئے دل سے مال کا شُحّ اور طمع دور کرتی ہے اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کے ضمن میں جن مدات کا ذکر پہلے آچکا ہے ان کے لئے دل کو کشادہ کرتی ہے۔ گویا زکوٰۃ وہ چیز ہے جو صدقاتِ نافلہ کے لئے STARTER کا کام انجام دیتی ہے۔ زکوٰۃ وہ چیز ہے جو فرض کر دی گئی ہے۔ اسے تو نصاب کے مطابق ہر سال ہر حال میں ادا کرنا ہے' لامحالہ دینا ہے۔ دینا نہ چاہو گے تو خالص

اسلامی ریاست میں زبردستی لے لی جائے گی۔ زکوٰۃ کی فرضیت کی صورت میں آپ کے سامنے فزکس کا "STATIC FRICTION" کا اصول آئے گا۔ یعنی اگر کوئی چیز کھڑی ہو تو اس کو حرکت میں لانے کے لئے بہت قوتِ استعمال کرنی پڑتی ہے' چل پڑے تو اب ذرا سی قوت بھی اس کی حرکت کو برقرار رکھ سکے گی۔ لہٰذا انفاق کی راہ پر چلانے کے لئے ابتدائی محرک زکوٰۃ سے فراہم ہوتا ہے۔ دل پر مال کی محبت کی جو مہر لگی ہوئی ہے اسے توڑنے والی چیز زکوٰۃ ہے۔ اب جبکہ ایک کام کا آغاز ہو گیا تو پھر صدقاتِ نافلہ کے لئے بھی بند مٹھی کھل جائے گی۔ صدقاتِ نافلہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں وہ آیت بھی آتی ہے کہ (ترجمہ) "(اے نبیؐ) یہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں" یعنی اس پر جو اتنا زور دیا جا رہا ہے تو اس کی آخری حد کیا ہے....؟ فرمایا کہ "قُلِ الْعَفْوَ" "(اے نبیؐ) کہہ دیجئے' جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد و فاضل ہے اس کو دے ڈالو"۔ اس موقع پر یہ بات واضح طور پر سامنے رہنی چاہئے کہ یہ اخلاقی سطح پر ترغیب و تشویق ہے' قانونی معاملہ نہیں ہے۔ قانون اور عبادت کے طور پر زکوٰۃ فرض ہے۔

بین الانسانی معاملات کی اصلاح کی کلید: ایفائے عہد

آگے چلئے' میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ معاملاتِ زندگی میں ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے سارے معاملات معاہدوں (CONTRACTS) پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور کو آپ نے آٹھ گھنٹے کام کرنے کے لئے رکھا اور اس کی آپ نے ایک اجرت مقرر کی' یہ ایک معاہدہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو ماہانہ مشاہرے پر ملازم رکھا گیا ہے تو وہ بھی ایک معاہدہ ہے کہ یہ فرائض ہیں جو ان اوقات میں ادا کرنے ہیں اور اس کے عوض تمہیں یہ تنخواہ ملے گی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت اکثر کاروبار CONTRACTS کی بنیاد پر ہی ہو رہے ہیں۔ سپلائی ہو' تعمیرات کا کام ہو' وغیرہ وغیرہ' یہ سب معاہدوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں' بلکہ ہمارے جو سوشل معاملات ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر معاہدے کی بنیاد پر چل رہے ہیں' چاہے وہ تحریری معاہدے نہ ہوں۔ چنانچہ شاید آپ کے علم میں ہو کہ شادی کو بھی ایک سماجی و عمرانی معاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیکی کی بحث میں ایفائے

عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ دینی اور محاسبۂ اخروی کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ سورۃ الاسراء میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا : ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ "اور پورا کرو عہد' بے شک عہد کی پوچھ گچھ ہوگی"۔

صبر و مصابرت

اب آخری بات آئی ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ یہاں "الصَّابِرُون" نہیں کہا بلکہ "الصَّابِرِین" فرمایا جس کا تعلق نحوی اسباب سے ہے' جس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اسی اسلوب کے تحت میں نے ترجمہ میں ایک لفظ کا اضافہ کیا تھا' وہ تھا "خصوصاً" گویا مفہوم ہوا (ترجمہ) "خاص طور پر ذکر ہے صبر کرنے والوں کا"۔ یہ صبر کس کس کام میں مطلوب ہے' اس کا بیان آگے آگیا۔ فقرو فاقہ' تنگی اور جسمانی یا ذہنی اذیت اور کوفت کے مواقع پر' پھر نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں آجانے کے مرحلے پر۔ اس بات سے ایک چیز آپ کے سامنے واضح ہو جانی چاہئے' وہ یہ کہ بڑا بنیادی فرق ہے ایک راہبانہ تصورِ نیکی میں اور قرآن مجید کے اس تصورِ نیکی میں جو اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہو رہا ہے۔ راہبانہ تصورِ نیکی میں نیک لوگ میدان چھوڑ کر اور معاشرہ سے فراریت اختیار کر کے غاروں اور کھوؤں میں یا کہیں گھنے جنگلات میں جا کر تپسیائیں کرتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو عین معاشرے اور تمدن کے منجدھار میں رکھ کر نیکی کی تلقین کرتا ہے' پھر یہ کہ پسپائی اور فراریت نہیں ہے بلکہ بدی کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی' اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کا سبق اور تلقین ہے۔ نیکی کا دنیا میں بول بالا کرنے کے لئے مصائب جھیلنا' فقر و فاقہ برداشت کرنا' یہاں تک کہ جان کی بازی کھیل جانا اسلام کے نزدیک نیکی کی معراج ہے۔

خیرِ اعلیٰ

دنیا میں جو نظام ہائے اخلاق رائج ہیں ان سب میں ایک تصور ہوتا ہے کہ خیرِ اعلیٰ (Highest Good) یا (Summum Bonum) کیا ہے! سب سے اونچی نیکی کون سی ہے! تو قرآن حکیم کی رو سے سب سے بلند' سب سے اونچی اور سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ

نیکی کی ترویج کے لئے ' خیر کی تلقین کے لئے ' حق کے غلبے کے لئے ' اجتماعی نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے ' صداقت ' دیانت اور امانت کی بالادستی کے لئے اپنی گردنیں کٹا دو....
چنانچہ اسی سورۂ بقرہ میں چند رکوع پہلے یہ الفاظ آئے ہیں : ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝﴾ "جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور و ادراک نہیں کر سکتے"۔ اور یہ مضمون ختم ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر :

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝﴾

"(اے نبی) بشارت دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی جانب ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور یہی ہیں ہدایت یافتہ و بامراد!"

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے کہ۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

میرا خیال ہے کہ علامہ نے یہ انداز قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے جو سورۃ الصف میں آئی ہے : ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝﴾ "(اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں) اللہ کو محبت ان سے ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"....
"وَالصّٰبِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ" میں ضمناً وہ بات بھی سامنے آگئی جو اس آیۂ بِر کے درس کے آغاز میں بیان کی گئی تھی کہ اس آیۂ مبارکہ میں اگرچہ تواصی بالحق کا لفظاً ذکر نہیں ہے لیکن معناً ذکر موجود ہے اور یہ بات خود بخود سامنے آ رہی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے اذہان و قلوب میں ایمان کی روشنی ہے ' جو خادمِ خلق ہیں ' جن کی کیفیت یہ ہے کہ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جو لوگ نماز اور زکوٰۃ پر کاربند ہیں' جو ایفائے عہد پر کاربند ہیں' ان کی جنگ کس مقصد کے لئے ہو سکتی ہے! یقیناً ان کی جنگ نفسانیت کے تحت نہیں ہو سکتی' ان کی جنگ ہوسِ ملک گیری کے لئے نہیں ہو سکتی' بلکہ فی سبیل اللہ (IN THE CAUSE OF ALLAH) ہی ہو سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

خاتمۂ کلام' راست بازی اور تقویٰ کا معیار

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر : ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۝﴾ "یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچے اور راست گو و راست باز ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعتاً متقی (اللہ کی نافرمانی سے بچنے والے) ہیں"۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے یعنی اپنے دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں حقیقی ایمان جاگزیں ہو اور جن کے اعمال میں نیکی کے ان اوصاف کا ظہور ہو رہا ہو جن کا اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہوا' اور صرف یہی لوگ حقیقی متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ سورۃ العصر کے چاروں مضامین یہاں موجود ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ میں کامیابی اور فوز و فلاح کے جن چار لوازم کا بیان ہوا ان کو اس آیۂ مبارکہ میں ایک نئے اسلوب' نئے انداز' نئے پیرائے' نئے سلسلۂ کلام (CONTEXT) میں ایک نئی بحث کے ضمن میں واضح فرما دیا گیا۔ حقیقتِ واحدہ وہی ہے جو سورۃ العصر میں آئی' اسی کو ہم نے ایک مرتبہ ایک نئی رعنائی کے ساتھ پھر دیکھ لیا۔ حقیقتِ نیکی اور تقویٰ کا جو قرآنی معیار قرآن حکیم کی اس عظیم آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا ہے' اس کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہو گا جب ہم یہ ارادہ اور عزم کر لیں کہ جو علم ہمیں قرآن و حدیث سے حاصل ہوا اس پر ہم عملاً کاربند ہونے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ